سچا اُمّتی کون؟

ترتیب وتدوین

محمد یونس جنجوعہ

شائع کردہ

تنظیمِ اسلامی

دارالاسلام مرکز تنظیم اسلامی، ملتان روڈ چوہنگ، لاہور 53800

فون: 78-35473375(042)

ای میل: markaz@tanzeem.org ویب سائٹ: www.tanzeem.org

فہرستِ مضامین

۱-ایمان: 5

۲-توقیر وتعظیم: 7

۳-نصرتِ رسُول ﷺ: 17

۴-اِتّباعِ نُور: 29

(یعنی قُرآنِ مجید کی تعلیمات پر عمل)

۵-خلاصۂ کلام: 36

ربیعُ الاوّل وہ مہینہ ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔ اسی نسبت سے اس ماہ میں کثرت کے ساتھ ایسی مجالس ومحافل منعقد کی جاتی ہیں جن میں پیغمبرِ اسلام ﷺ کی تعریف وتوصیف[1] کے علاوہ سیرتُ النّبی ﷺ کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔نعت خوانی ہوتی ہے اور آپ ﷺ کی خدمت میں محبت اور عقیدت کے اِظہار کے لیے سلام پڑھے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کھانا پکاتے ہیں اور گلی محلے کے ہمسایوں میں تقسیم کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ان ایّام میں آپ ﷺ کی ولادت کی خوشی منانے کے لیے کچھ دوسرے طریقے بھی اختیار کئے جاتے ہیں۔ان سارے کاموں سے ہم مسلمان ایک خوش فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ ہم نے نبی اکرم ﷺ کے اُمتی ہونے کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری ادا کرلی اور اتنا کچھ ہی کافی ہے۔ یہ جھوٹا اطمینان ہمیں یہ معلوم کرنے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونے دیتا کہ ہم غور کریں کہ حُضُورِ اکرم ﷺ سے محبت کے اصل تقاضے کیا ہیں اور آپ ﷺ کا سچا اُمتی بننے کے لیے قرآن حکیم میں ہمیں کن کن باتوں پر عمل کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ سیرتُ النّبی ﷺ کے عنوان سے منعقد ہونے والے اجتماعات اور جلسوں میں اس بات کو واضح کیا جانا چاہئے کہ آپ کے ساتھ ہمارا عقیدت ومحبت کا جو گہرا رشتہ ہے اس کے عملی تقاضے کون کون سے ہیں اور پھر ہم سنجیدگی کے ساتھ ان تقاضوں کی ادائیگی پر کمربستہ[2] ہوجائیں تاکہ اللہ کے ہاں ہمارا شمار آپ ﷺ کے سچے اُمّتیوں میں ہوجائے۔ اگر یہ ارادہ لے کر ہم کسی سیرت کانفرنس میں شریک ہوں یا سیرت کی کوئی محفل منعقد کریں اور کوئی پختہ عہد کرکے وہاں سے اٹھیں تو یہ بات یقیناً فائدہ منداور آنے والی حقیقی زندگی میں نفع بخش ہوگی۔

(۱)خوبی بیان کرنا (۲)تیار

آیئے ہم اس موضوع پر روشنی ڈالنے کے لیے قرآن مجید سے راہنمائی حاصل کریں جو اللہ تعالیٰ کا کلام اور سراسر حق وصداقت کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔ سورۃُ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کے آخری الفاظ اس طرح ہیں۔

﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾

"پس جو لوگ ایمان لائے اُن (نبی اکرم ﷺ) پر اور جنہوں نے اُن ﷺ کی توقیر[1] وتعظیم کی، اور جنہوں نے اُن ﷺ کی مدد اور حمایت کی (یعنی اُن کے مشن میں اُن ﷺ کے دست و بازو بنے اور اُن ﷺ کے مقاصد کی تکمیل میں اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھپایا) اور جنہوں نے اُس نور کا اتباع کیا جو اُن ﷺ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے، تو یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔"

اس آیت کے پہلے حصہ میں اہلِ کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے کہ یہی وہ "اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ" ہیں جن کی آمد کی خوشخبری پہلے انبیاء کرام علیہم السلام دیتے رہے ہیں اور یہ پیش گوئیاں تمہاری کتابوں تورات اور انجیل میں بھی موجود ہیں۔ اب ہمارے وہ رسول تمہارے پاس آگئے ہیں۔ یہ تمہیں بھلے کام کرنے کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں۔ پاکیزہ چیزوں کو حلال اور گندی چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں۔اس کے علاوہ رسم ورواج کی جن پابندیوں کو تم نے مقدس سمجھ کر اختیار کر رکھا ہے اُن کی بے سند حیثیت کو واضح کرکے تمہیں اُن سے نجات دلانے آئے ہیں تاکہ تمہارے لیے سہولت پیدا ہو اور خواہ مخواہ کے بوجھ تمہاری کمر سے اتر جائیں۔ پس جو لوگ اس (پیغمبر ﷺ) پر ایمان لائیں اور اُس ﷺ کی عزت وتوقیر کریں اور اس کی حمایت اور مدد کریں اور اس نور (ہدایت) کی پیروی کریں جو اُس ﷺ کے ساتھ نازل کیا گیا ہے (تو) وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

(۱)عزت

اب اس آیت کے اوپر ذکر کئے گئے حصہ پر غور کریں تو آپ ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چار بنیادیں سامنے آتی ہیں جن کو مضبوط کرنے سے ہی ہم آپ ﷺ کے سچے امتی بن سکتے ہیں۔

۱) آپ ﷺ پر ایمان لایا جائے اور تصدیق کی جائے۔
۲) آپ ﷺ کی عزت و توقیر کی جائے۔
۳) آپ ﷺ کی نصرت و حمایت کی جائے۔
۴) آپ ﷺ پر جو نورِ ہدایت یعنی قرآن مجید نازل کیا گیا ہے اُس کا اتباع اور پیروی کی جائے۔

اب ان چاروں بنیادوں کے متعلق علیحدہ علیحدہ کچھ تفصیلی ذکر کیا جاتا ہے تاکہ غور و فکر کے لیے مزید راہیں کھل سکیں۔

ایمان

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی اوّلین بنیاد یہ ہے کہ ہم آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور تصدیق کریں یعنی آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا پیغام برحق تسلیم کریں اور اس یقین کو دل کی گہرائیوں میں جگہ دیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے اور حضور ﷺ کے درمیان ایک رشتے اور تعلق کا آغاز ہو جاتا ہے۔ امتِ مسلمہ میں چند سادات[1] اور ہاشمیوں[2] کو چھوڑ کر کسی کا بھی آپ ﷺ کے ساتھ نسل اور خون کا تعلق نہیں۔ اس کے باوجود ہر امتی کو آپ ﷺ کے ساتھ ایک نسبت اور تعلق حاصل ہے اور یہی نسبت سب سے اہم اور سب سے مضبوط تعلق ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے دل میں یہ بات صحیح طور پر بیٹھ جاتی ہے کہ آپ ﷺ جو کچھ بھی فرماتے ہیں وہ اللہ کی طرف سے ہدایت کا پیغام ہوتا ہے۔ آپ ﷺ تمام انسانوں کی طرف بشیر (خوشخبری سنانے والے) اور نذیر (خبردار کرنے والے) بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ اسی بات کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا﴾ (سبا:28)

"اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا (بنا کر)۔"

یہ حقیقت بھی ہر ایک کے علم میں ہے کہ ایمان کے دو درجے ہوتے ہیں ایک "اقرارٌ باللّسان" اور دوسرا "تصدیقٌ بالقلب"۔ یعنی زبان سے اقرار کرنا اور دل سے اسے سچا ماننا۔ یہ دونوں پہلو موجود ہوں گے تو یقین کامل ہوگا اور ایمان مکمل ہوگا۔ کیونکہ صرف زبانی اقرار ہو مگر دل میں یقین نہ ہو تو یہ منافقت ہے۔ مدینہ کے منافقین زبان

(۱) حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد (۲) حضور ﷺ کے پردادا حضرت ہاشم کی اولاد

سے تو آپ کی رسالت کا اقرار کرتے تھے جیسا کہ سورۃ المنافقون کے آغاز میں ہے۔

﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ﴾

(المنافقون:1)

"جب منافق آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں۔"

پھر اقرار کے اِظہار[1] کے لیے آپ کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔ رمضان کے روزے رکھتے تھے۔ زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے لیکن ان کے دل نورِ ایمان سے خالی تھے لہٰذا یہ رویّہ نفاق ٹھہرا جس کا نتیجہ جہنم ہے اور جہنم کا بھی سب سے نچلا حصہ۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ﴾ (النساء:145) یقیناً منافق تو آگ کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص آپ ﷺ کو دل کی گہرائیوں سے اللہ کا رسول مانتا ہو مگر بولنے کی طاقت رکھنے کے باوجود زبان سے اس کا اقرار نہ کرے تو قانونِ شریعت کی رُو سے وہ شخص کافر قرار پائے گا۔ پس دنیا میں وہی شخص مسلم سمجھا جائے گا جو زبان سے کلمہ شہادت کا اقرار کرے کہ "اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ" اور آخرت میں وہی شخص مومن مانا جائے گا جو زبانی اقرار کیساتھ تصدیقٌ بالقلب کی دولت سے بھی مالا مال[2] ہو اور یہ یقین رکھتا ہو کہ محمد بن عبداللہ، اللہ کے آخری نبی ﷺ اور رسول ﷺ ہیں اور اُن پر نازل ہونے والا کلام، قرآن مجید کی صورت میں ہمارے سامنے ہے جو کسی بھی قسم کی تحریف[3] سے محفوظ ہے اور قیامت تک اسی طرح محفوظ رہے گا۔ اب نہ کوئی نیا نبی آئے گا اور نہ کوئی نئی کتاب نازل ہوگی۔ الغرض زبانی اقرار کے ساتھ قلبی یقین بھی ضروری ہے اور ایمان کی تکمیل ان دونوں کے یکجا[4] موجود ہونے سے ہی ہوگی۔

(۱) ظاہر کرنا (۲) بھرا ہوا (۳) تبدیلی (۴) ایک جگہ

توقیر و تعظیم

ایمان کی ان دونوں سطحوں پر موجودگی سے لازمی طور پر انسان کے عمل میں کچھ اثرات پیدا ہوں گے، جیسا کہ آگ کے جلا دینے کی تاثیر کو ہم یقینی سمجھتے ہیں تو آگ میں ہرگز ہاتھ نہیں ڈالتے۔ پس جب آپ ﷺ کی رسالت پر یقینِ قلبی حاصل ہو تو لازماً اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ ﷺ کو عام انسان نہیں سمجھا جائے گا اور پھر آپ ﷺ کے ساتھ عام لوگوں کا سا رویہ بھی نہیں رکھا جائے گا۔ جیسا کہ خود قرآن مجید میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اس طرح نہ آواز دو جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو آواز دیتے ہو۔ گویا رسالت کے پختہ اقرار کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ﷺ کی عزت و تکریم[1] کی جائے گی جیسا کہ زیرِ عنوان آیت میں ایمان بالرسالت کے بعد عَزَّرُوْهُ کے الفاظ ہیں یعنی اُن ﷺ کی عزت و تکریم کرو۔ کیونکہ وہ ﷺ رب العالمین کے برگزیدہ[2] بندے اور خالقِ کائنات کے بھیجے ہوئے ہیں جنہیں ہماری ہدایت و راہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ انہوں نے ہمیں جو کچھ بتایا وہ اللہ تعالیٰ ہی کا پیغام ہے۔ اگر کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہے تو وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جس کام سے رکنے کو کہا ہے تو وہ بھی حکمِ ربّ کے مطابق ہی کہا ہے۔ حلال و حرام کے سلسلہ میں انہوں نے جو احکام دیئے ہیں وہ بھی اپنی مرضی سے نہیں بتائے بلکہ ہر بات اللہ کی طرف سے پیش فرمائی ہے۔ جیسا کہ سورۃ النّجم میں ارشاد ہوا ہے۔

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾

"اور یہ پیغمبر اپنی خواہشِ نفس سے بات نہیں کرتے یہ تو صرف وحی ہوتی ہے جو اُن کی طرف بھیجی جاتی ہے۔"

پس معلوم ہوا کہ ایمان بالرّسالت کا فطری اور لازمی نتیجہ آپ ﷺ کی عزت و توقیر اور ادب و احترام ہے۔

(۱) تعظیم کرنا (۲) چُنا ہوا

اسی بات کو سورۃ الحجرات آیت نمبر ۲ میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ مسلمان رسول ﷺ کے ادب واحترام کو ہمیشہ پیش نظر رکھیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ۝۲﴾ (الحجرات:2)

اے مومنو! نبی ﷺ کی آواز سے اپنی آوازیں بلند نہ کرو، اور ان کے سامنے اونچی آواز سے نہ بولو، جیسا کہ تم ایک دوسرے سے بلند آواز میں گفتگو کرتے ہو، کہیں تمہارے سارے اعمال برباد ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔

یہ اس لیے فرمایا کہ جب انسان یہ سمجھ رہا ہو کہ اُس نے کوئی نافرمانی تو کی نہیں بلکہ اطاعتِ رسول پر کاربند ہے تو اُسے اعمال ضائع ہو جانے کا احساس کیسے ہوگا۔ مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ نافرمانی اور معصیت[1] تو دُور کی بات ہے صرف ادب کے تقاضے کو پورا نہ کرنے پر اچھے بھلے اعمال کے ضائع ہو جانے کی وعید[2] سنائی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصحابِ رسول ﷺ میں سے ایک صاحب نے جب یہ آیت سنی تو آپ ﷺ کی مجلس میں بیٹھنا چھوڑ دیا جب پوچھا گیا تو کہنے لگے کہ میری آواز فطرتاً[3] بلند ہے اس لیے محفلِ رسالت میں نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے سارے اعمال ضائع ہو جائیں۔ پس سورۃ الحجرات کی اس آیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی کہ ایمان بالرّسالت کا اولین نتیجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کا ادب واحترام ملحوظ رکھا جائے اور عزت وتوقیر کی جائے۔

جب رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا کر اُن کے ادب واحترام کو اختیار کر لیا جائے گا تو آپ ﷺ کی پیروی کرنے اور آپ ﷺ سے محبت رکھنے کے جذبات خود بخود پیدا ہو جائیں گے اور اس کا پیمانہ[4] یہ ہوگا کہ جیسے ہی قولِ رسول ﷺ سامنے آئے گا، تو پھر اپنی یا کسی اور کی بات کی کوئی قدر[5] نہیں ہوگی اور آپؐ ہی کے فرمان کو اختیار کیا جائے گا۔

(۱) نافرمانی (۲) دھمکی (۳) قدرتاً (۴) ناپنے کا آلہ (۵) درجہ

اطاعتِ رسول ﷺ

جس ہستی کا ادب واحترام اور عظمت اس حد تک ذہن میں موجود ہو تو اُس کی اطاعت پر تو دل ضرور مائل[1] ہوگا۔ اسی لیے یہاں حدیث کے واضح الفاظ میں اس شخص کے ایمان کی نفی کر دی گئی ہے جس کے ہاں فرمُوداتِ رسولؐ کی اطاعت نہ ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ))

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لے کر آیا ہوں۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد جب تک احکامِ شریعت، حلال وحرام اور اوامر ونواہی، جو رسول اللہ ﷺ نے قرآن وحدیث کے ذریعے پیش کئے ہیں، کی پابندی خوش دلی کے ساتھ قبول نہیں کی جاتی تو کیسا ایمان اور کیسی عزت وتوقیر۔

رسول اللہ ﷺ کی کامل اطاعت اور قرآن وسنت کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ایمان بالرّسالت کی شرطِ لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں اللہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہاں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم بھی ساتھ ہی موجود ہے۔ بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ رسول ﷺ کی اطاعت ہی دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔ دیکھئے سورۃ النساء آیت نمبر ۸۰ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی"۔ پھر سورۃ آلِ عمران آیت ۳۲ ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ﴾ "کہہ دیجئے اطاعت کرو اللہ کی اور رسول ﷺ کی" اسی طرح سورۃ التغابن آیت ۱۲ میں فرمایا گیا ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ﴾ یعنی "اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول ﷺ کی"۔

یہاں ادنیٰ[2] سا غور کرنے سے انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ جس شخص نے

(۱) راغب (۲) معمولی

آپ ﷺ کو اللہ کا رسول اور اُس کا نمائندہ مان لیا تو اب اُس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں کہ وہ آپ ﷺ کا ہر حکم دل و جان سے تسلیم کرے اور آپ ﷺ کے ارشاد پر لبیک کہے۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو بھی رسول بنا کر بھیجتا تھا اُس کی اطاعت کا بھی حکم دیتا تھا۔ دیکھئے سورۃ النساء ۶۴ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ "اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے"۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ خود تو اپنے احکام لے کر ہمارے پاس نہیں آتا۔ وہ اپنے احکام ہم تک پہنچانے کے لیے انبیاء و رُسُل کو واسطہ[1] بناتا رہا ہے۔ اسی طرح اللہ کی اطاعت کا واحد ذریعہ بھی رسولؐ کی اطاعت قرار پاتا ہے۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا۔ ((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ))(بخاری و مسلم عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ) "جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی"۔

سُورۃ النّجم کی آیت ۲، ۳ میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، یہ بات واضح کر دی گئی کہ آپ ﷺ اپنی خواہشِ نفس سے زبان نہیں کھولتے، بلکہ وہ تو اللہ کا ہی حکم ہوتا ہے۔ پس ایسے احکام کو ماننا لازمی قرار پاتا ہے۔

سورۃ النساء کی آیت ۶۵ میں اس بات کو مزید واضح کر کے بیان کر دیا گیا:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵﴾

پس نہیں۔ آپ ﷺ کے رب کی قسم۔ یہ لوگ ہرگز مومن نہیں ہوں گے جب تک اپنے جھگڑوں میں آپ ﷺ ہی کو حَکَم (مُنصِف) نہ مانیں۔ پھر جو فیصلہ آپ ﷺ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیں۔

(۱) ذریعہ

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بس رسمی انداز میں مطلوب نہیں بلکہ اپنے ہر جھگڑے اور اختلاف میں آپ ﷺ ہی کی طرف رُجوع کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر اس پر آپ کے فیصلے کو مارے باندھے نہیں، بلکہ پوری آمادگی اور خوش دلی کے ساتھ قبول کرنے کو ہی ایمان کی سلامتی کی علامت سمجھا گیا ہے۔ پس آپ ﷺ کی ذات کو صرف مرکزِ عقیدت سمجھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ آپ ﷺ کو مرکزِ اطاعت تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اطاعتِ کلّی کے بغیر ایمان کا اقرار تو صرف زبانی دعویٰ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول نہیں۔

محبت

رسول اللہ ﷺ کی محبت بھی ایمان بالرّسالت کا تقاضا ہے۔ جب آپ ﷺ کو اللہ کا پیغمبر مان لیا۔ آپ کی ہستی کو واجب الاطاعت سمجھ لیا۔ آپ ﷺ کے ادب و احترام کو تسلیم کر لیا تو اس کا لازمی نتیجہ محبت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ چنانچہ رسولُ اللہ ﷺ کی محبت مسلمان کا جزوِ ایمان ہے۔ بلکہ آپؐ کے ساتھ ایسی محبت ہونی چاہئے جس پر دنیا کی ہر چیز قربان کی جا سکے۔ مسلم اور بخاری میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا——

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَ وَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ))

"تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک میں اس کے لیے اس کے باپ، اس کے بیٹے اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں۔"

یعنی اگر کسی مسلمان کے دل میں حضور ﷺ کی محبت اپنے تمام اعزّہ و اقارب[1] اور تمام انسانوں سے بڑھ کر نہیں ہے تو گویا وہ ایمانِ حقیقی سے محروم ہے ایسے شخص کو وہ ایمان حاصل نہیں جس کی بنیاد پر عدالتِ خداوندی میں جزا و سزا کے فیصلے صادِر[2] ہوں گے۔

(۱) رشتے دار (۲) نافذ ہونا

اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروقؓ کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے اُنؓ سے پوچھا اے عمرؓ! "تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟" یہ اندازِ گفتگو بھی نوٹ کرنے کے قابل ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے اور عمر فاروقؓ کے درمیان کس قدر اپنائیت کا جذبہ موجود تھا کیونکہ اس طرح کا سوال اُسی ہستی سے ہوسکتا ہے جس کی محبت، قرب اور جان نثاری[1] ہر قسم کے شک وشبہ سے بالاتر[2] ہو۔ بہرحال حضرت عمر فاروقؓ نے جواب میں عرض کیا۔ "حضور آپ ﷺ مجھے دنیا کے ہر انسان سے زیادہ محبوب ہیں"۔ حضور ﷺ نے پھر دریافت فرمایا: "اور خود اپنی جان سے بھی؟" اس پر حضرت عمرؓ نے کچھ توقُّف[3] کیا اور پھر عرض کیا "ہاں اب" یعنی اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ ﷺ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز اور پیارے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک لمحے کے توقُّف میں آپ ﷺ نے سوچ سمجھ کر اپنا جائزہ لیا، دل میں جھانکا اور پھر جواب دیا۔ جبکہ آج کے نعت خواں حضرات کا انداز کچھ اور ہے۔ نعت کہتے وقت تو تعریف وتوصیف[4] میں زمین وآسمان کے قُلّابے مِلا دیے[5] مگر عملی پہلو میں صفر۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ حالانکہ خوشامد کے انداز کی تعریف تو ویسے بھی اخلاقی کمزوری شمار ہوتی ہے نہ کہ کوئی قابلِ تعریف شے۔ اصل چیز تو خلوص واخلاص ہوتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی طرف سے یہ جواب سن کر آپ نے فرمایا عمرؓ! اب تم مقامِ مطلوب تک پہنچ گئے ہو۔ یعنی اگر میں تمہیں ہر چیز، ہر انسان حتّٰی کہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہوگیا ہوں، تو اب میرا اور تمہارا تعلق، وہ تعلق ہے جو ربُّ العزت کے ہاں مطلوب ہے۔

اِتّباع[6]

جب کسی ہستی کے ساتھ قلبی لگاؤ، محبت اور پیار کا تعلق حقیقی بنیاد اور پوری آمادگی اور خوش دلی کے ساتھ قائم ہوجائے تو انسان اُس کے ہر حکم کی صرف اطاعت ہی نہیں کرتا بلکہ اُس کی ہر ادا اور ہر اشارے پر لبیک کہنے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ وہ ہر وقت محبوب کی پسند اور ناپسند کا خیال رکھتا ہے۔ اُسے محبوب کی چال ڈھال، اٹھنے بیٹھنے کا انداز، خوراک

(۱) جان قربان کرنا (۲) بہت اونچی (۳) وقفہ (۴) خوبی بیان کرنا (۵) بہت مبالغہ کرنا (۶) پیروی

اور لباس پہننے کی عادات پیاری لگتی ہیں۔ وہ اپنے محبوب کی اداؤں کو بھی اپنانے کی کوشش کرتا ہے خواہ اُسے ان چیزوں کے بارے میں کوئی حکم نہ بھی دیا جائے۔ محبت بھرے جذبات اور خوش دلی کے ساتھ محبوب کے حکم کو بجالانا تو اطاعت ہے مگر اُس کے چشم وابرُو کے اشارے[1] کو سمجھنا اور اُس کی اداؤں کی نقالی کرنا اطاعت سے ایک قدم آگے کا رویّہ ہے اور یہ اِتّباع کہلاتا ہے۔ چونکہ صحابہ کرامؓ حضور ﷺ کے صحیح قدر شناس[2] تھے اور انہیں آپ ﷺ کے ساتھ بے پناہ محبت تھی اس لیے اِتّباع رسول ﷺ کی انتہائی تابناک مثالیں صحابہ کرامؓ کی سیرت میں ملتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھئے اتباع رسول ﷺ میں بہت اونچے مقام پر تھے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے۔ آپ ﷺ کا گزر ایک خاص درخت کے نیچے سے ہوا۔ اب حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب بھی اُس راستے سے گزرتے تو اُس درخت کے نیچے سے ہوکر گزرتے کہ آپ ﷺ کو انہوں نے وہاں سے گزرتے دیکھا تھا۔ اسی طرح حجۃ الوداع کے سفر کے دوران راستے میں جہاں جہاں آپ ﷺ نے قیام کیا، آرام کیا یا رفعِ حاجت کے لیے گئے، بعدازاں مکّے کے سفر کے دوران اُنہی مقامات پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے قیام کیا، آرام کیا اور رفعِ حاجت کے لیے گئے۔ ظاہر ہے اس کے بارے میں آپ ﷺ کا حکم نہ تھا اور نہ ہی شریعت میں یہ عمل کرنا ضروری تھا۔ ہوسکتا ہے آج کل کا کوئی عقلیت پسند[3] تو اس انداز کو خواہ مخواہ کا تکلّف یا شاید جُنون سمجھے لیکن یہ محبت کا معاملہ ہے، جس میں محبوب کی پیروی اور نقالی سے زیادہ لذیذ شے اور کوئی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ایک صحابیؓ کا ذکر ملتا ہے کہ وہ کہیں دُور دراز سے چل کر مدینہ تشریف لائے، آپ ﷺ سے ملاقات ہوئی، اتفاق سے اس وقت آپ ﷺ کا گریبان کھُلا تھا۔ اُن صحابیؓ نے پھر زندگی بھر اپنے کرتے میں بٹن لگا کر گریبان بند نہیں کیا کیونکہ انہوں نے آپ ﷺ کو اسی انداز میں دیکھا تھا۔ یہاں بھی دیکھئے آپ ﷺ نے اُنہیں ایسا کرنے کا حکم تو نہ دیا تھا اور نہ ہی کوئی اشارہ دیا تھا۔ لیکن یہ

(۱) معمولی اشارہ (۲) قدر جاننے والا (۳) صرف عقل کو معیار سمجھنے والا

بات سچی محبت کا تقاضا ہے اور اس کی لذّت وہی شخص محسوس کرسکتا ہے جو اِتباعِ محبوب کی اس منزل پر ہو۔

سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر ۳۱ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۱﴾

"اے نبی ﷺ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اُس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تم سے محبت کرے گا۔ اور تمہاری خطاؤں کو معاف فرما دے گا۔ اور اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے"۔

یہ آیت کریمہ ظاہر کرتی ہے کہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے محبت کا لازمی تقاضا رسول اللہ ﷺ کا اِتّباع ہے۔ اسی اِتّباع کے نتیجے میں ہم اللہ کی محبت میں پختہ تر ہوتے جائیں گے، پھر جس کو یہ مقام و مرتبہ نصیب ہو جائے وہ کتنا خوش بخت اور نصیب والا ہوگا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے دوبارہ یاددہانی ہو جائے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی اولین اور اہم ترین بنیاد اُن کی رسالت پر ایمان لانا ہے جس کا زبان سے اظہار اور دل سے اِقرار(۱) ضروری ہے۔ پھر اسی ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ آپ ﷺ کی تعظیم و تکریم کی جائے۔ اس تعظیم و توقیر اور عزت و احترام کے ناگزیر لوازِم(۲) —— پُرخلوص اطاعت اور محبتِ قلبی ہیں۔ ایسی محبت جو ہر دوسری چیز کی محبت پر غالب ہو۔ اگر انسان یہاں تک پہنچ گیا تو گویا اب پیغمبر کا ہر اشارہ اور ہر ادا اُس کے لیے محبوب ہو جائے گی اور یہی اتّباع ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ سورۃ آل عمران کی اوپر درج کی گئی آیت میں اسی بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو رسول ﷺ کا اتّباع اپنے اوپر لازم کرلو۔ اس کے نتیجہ میں اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے قصور معاف فرما دے گا۔

(۱) ماننا (۲) لازمی چیزیں

اِنتباہ(۱)

یہاں یہ بات جان لینا بھی ضروری ہے کہ ایمان اور عزت و توقیر دونوں ہی ضروری ہیں۔ ان میں سے ایک غائب ہو تو یہ ادھورا(۲) طرزِ عمل آخرت میں نجات کے لیے کافی نہ ہوگا۔ بلکہ اگر ایمان کا دعویٰ بھی ہے اور ساتھ مارے باندھے کی اطاعت بھی ہو رہی ہے، یعنی اطاعت دلی آمادگی کے ساتھ نہیں بلکہ رسماً یا دکھاوے کی ہے تو یہ طرزِ عمل منافقین کے ساتھ ایک مشابہت رکھتا ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کے دَور کے منافقین بھی ایمان کے مدعی(۳) تھے بلکہ اطاعت بھی کرتے تھے مگر اُن کی اطاعت مجبوری کی تھی۔ ذرا غور کیجئے آج کے آزاد خیال مسلمان، جو نہ صرف اطاعتِ رسول ﷺ سے گُریزاں(۴) ہیں بلکہ آپ ﷺ کے احکام کا مذاق بھی اڑاتے ہیں، دین کی بنیادی تعلیمات مثلاً جنت، دوزخ، ملائکہ، نزولِ وحی کا انکار کرتے ہیں اور اسلام کے نظامِ زندگی کو ناقابلِ عمل (Out Dated) قرار دیتے ہیں، ہمارے معاشرے میں مسلمان ہی سمجھے جاتے ہیں۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایسا ممکن نہ تھا کہ کوئی مسلمان اسلامی عقائد کے بارے میں اس طرح کی گفتگو کرسکے بلکہ وہاں تو منافقین بھی ایسا نہ کرسکتے تھے، وہ فرائضِ دینی کی ادائیگی کا اہتمام کرتے، نمازیں پڑھتے اور شعائرِ دین(۵) کا احترام بھی کرتے تھے۔ پھر وہ قسمیں کھا کھا کر اپنے سچا اور مخلص ہونے کی یقین دہانی کروانے کی کوششیں کرتے تھے۔ مگر یہ سارے جتن کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اُن کو منافق ہی کہا۔ کیونکہ نہ اُن کو قلبی یقین حاصل تھا اور نہ واقعی اور حقیقی محبت۔ دیکھئے سورۃ المنافقون آیت نمبر ۱

﴿ اِذَا جَاۗءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾

"اے نبی ﷺ! جب یہ منافق آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ

(۱) خبردار کرنا (۲) نامکمل (۳) دعویٰ کرنے والا (۴) پرہیز کرنے والا (۵) دین کی علامات

آپ ﷺ اس کے رسول ہیں، اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بیشک یہ منافق (اپنے قول میں) جھوٹے ہیں۔"

یعنی اُن کے منہ سے نکلنے والے یہ الفاظ تو سچے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں لیکن نہ یہ دل سے آپ ﷺ کو رسول مان رہے ہیں اور نہ ہی ان کو آپ ﷺ کے ساتھ سچی محبت ہے اس لیے یہ جھوٹے ہیں، ان کے قول کا کوئی اعتبار نہیں۔ پس ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر حقیقی ایمان اور خوش دلی اور محبت کے ساتھ آپ ﷺ کی اطاعت ہی آپ ﷺ کے ساتھ تعلّق کی اَوّلین بنیاد قرار پاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر طرزِ عمل یہ ہو کہ آپ ﷺ کے ساتھ محبت کے محض دعوے ہوں لیکن نہ تو اطاعت ہو، نہ فرائض کی ادائیگی کا اہتمام اور نہ اَوامر و نَواہی کی پرواہ تو یہ طرزِ عمل فِسق و فُجُور، نافرمانی اور خُود فریبی [1] کے سوا کچھ نہیں۔ اس قسم کا دعویٰ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول نہ ہوگا۔ بلکہ اس قسم کا دعویٰ تو دنیا میں بھی تسلیم نہیں کیا جاتا کہ کسی کے ساتھ محبت تو جتائی [2] جائے مگر اُس کا کہنا نہ مانا جائے۔ اُس بیٹے کو باپ کے ساتھ خاک محبت ہے جو باپ کی بات تو مانتا نہیں مگر خوشامدانہ تعریف بہت کرتا ہے۔

جان لیجئے کہ عشقِ نبی ﷺ اور محبتِ رسول ﷺ کے بلند بانگ [3] دعوے، وجد آفریں [4] نعتیں، لمبے چوڑے سلام، پُرجوش اور شاندار جلوس، پرتکلّف محافلِ میلاد اور سیرت کے جلسے اگر اطاعتِ رسول اور پیروئ سنت سے خالی ہیں تو یہ سب کچھ محض ڈھونگ اور خود فریبی ہے۔ اس کا حقیقت سے کچھ تعلق نہیں۔ میزان میں یہ سب کچھ بے وزن ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اُس کی پرکاہ [5] کے برابر وقعت [6] نہیں۔ کیونکہ ہر کسی کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے مگر اللہ تعالیٰ دھوکہ کھانے سے پاک اور برتر ہے۔ بلکہ ہر دھوکے باز اس کی گرفت [7] میں ہے۔

(۱) اپنے آپ کو دھوکا دینا (۲) یاد دلانا (۳) اونچے (۴) وجد میں لانے والی
(۵) گھاس کا تنکا (۶) قدر (۷) پکڑ

نُصرتِ رسول ﷺ

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ میں ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد "وَنَصَرُوْهُ" کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے یعنی جن لوگوں نے آپ ﷺ کی مدد اور حمایت کی۔ یہاں ہمیں دیکھنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حمایت اور مدد کس کام میں مطلوب ہے، تو جان لیجئے کہ ہر رسول پر ایک بھاری ذمہ داری ہوتی ہے جسے وہ ہر حال میں ادا کرتا ہے یعنی بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھانا، شرک کے اندھیروں میں گم لوگوں کو نورِ توحید سے آشنا [1] کرنا۔ اعمالِ صالحہ اور مکارمِ اخلاق [2] کو رواج دینا۔ معاشرے سے ظلم و زیادتی کو ختم کر کے عدلِ اجتماعی کا نظام قائم کرنا اور لوگوں کو اس بات سے خبردار کرنا کہ ایک روز "اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ" [3] کے حضور کھڑے ہو کر دنیا میں کئے ہوئے اعمال کی جواب دہی کرنا پڑے گی، جس کے نتیجہ میں یا تو جنت کی ابدی راحتیں ملیں گی یا جہنم کا سخت عذاب۔ پیغمبر کا فرضِ منصبی یہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو بتا دے کہ آخرت کے حساب کتاب کے وقت کوئی کسی کے کام نہ آئے گا بلکہ بڑے سے بڑا رشتہ و تعلق بھی ختم ہو جائے گا۔ ہر کسی کو انفرادی طور پر خدا کے حضور پیش ہو کر حساب دینا ہوگا۔ ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾﴾ (النجم:38، بنی اسرائیل:15، الانعام:164، فاطر:18، الزمر:7) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا" اور ﴿يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۭ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾﴾ (الانفطار:19) "جس روز کوئی کسی کے بارے میں اختیار نہ رکھے گا اور حاکمیت صرف اللہ کی ہوگی"۔ اس روز اس دنیا میں کی ہوئی اچھائی یا بُرائی کا ریکارڈ ہر شخص کے سامنے ہوگا اور اُس پر اُس کی کامیابی یا ناکامی کا اعلان کیا جائے گا۔

قرآنِ مجید میں روزِ آخرت کی منظر کشی بہت سے مقامات پر کی گئی ہے سورۃ النّازعات کی آیات ۳۵ تا ۴۱ میں فرمایا گیا۔

﴿يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى ﴿۳۵﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ

(۱) جان پہچان کروانا (۲) اخلاقی خوبیاں (۳) سب سے بڑا حاکم

يَّرٰى ﴿۳۶﴾ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ﴿۳۷﴾ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۳۸﴾ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ
هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۳۹﴾ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ
الْهَوٰى ﴿۴۰﴾ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ﴿۴۱﴾ (النازعات:35 تا41)

"جس روز انسان اپنا سب کیا دھرا یاد کرے گا اور ہر دیکھنے والے کے سامنے دوزخ کھول کر رکھ دی جائے گی، تو جس کسی نے سرکشی کی ہوگی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی ہوگی تو دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگا، اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا[1] تو جنت اس کا ٹھکانہ ہوگا۔"

تبلیغ کا کٹھن کام

وہ کون سا سخت مشکل کام تھا جس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر ڈالی جس کا ذکر سورۃ المزّمل آیت نمبر ۵ میں ان الفاظ میں آیا ہے۔ ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴿۵﴾﴾ یعنی "ہم عنقریب آپ ﷺ پر ایک بھاری فرمان نازل کریں گے" اور پھر اس کے چند دنوں کے بعد ہی بھاری ذمہ داری کا بوجھ آپ ﷺ کے کندھوں پر ڈال دیا گیا کہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ﴿۳﴾﴾ (المدثر:1 تا3) یعنی "اے کپڑا اوڑھ کر لیٹنے والے! کھڑے ہو جاؤ اور خبردار کرو (نیند کے ماتوں[2] کو ہوشیار کرو، انہیں ڈراؤ) اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو"۔ یہ تھی وہ بھاری ذمہ داری اور یہی تھا آپ ﷺ کا فرضِ منصبی۔ آپ کو شرک کے اندھیروں کو دور کر کے نُورِ توحید پھیلانا تھا۔ باطل کے ساتھ پنجہ آزمائی[3] کر کے اُسے نیچا دکھانا اور حق کا بول بالا کرنا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے دین، یعنی دینِ حق کو تمام نظام ہائے زندگی پر غالب و نافذ کرنا تھا۔

سورۃ المدّثر کی تیسری آیت میں آپ ﷺ کو تکبیرِ ربّ کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس سے مراد صرف زبان سے اللہ اکبر کہنا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کو دنیا والوں سے تسلیم کروانا اور فی الواقع[4] وہ نظام برپا کرنا ہے جس میں حاکمیت اعلیٰ (Sovereignty) فقط اللہ

(۱) روکا (۲) نیند میں مست۔ غافل (۳) مقابلہ (۴) حقیقت میں

تعالیٰ کے لیے مانی جائے۔ اُسی کا فیصلہ حرفِ آخر قرار پائے۔ اسی بات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا "جس طرح اُس عزّوجل کی مرضی، آسمانوں میں پوری ہوتی ہے اسی طرح زمین پر بھی پوری ہو"۔ گویا قرآن مجید کے الفاظ میں ﴿وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ؕ﴾ (التوبہ:40) "اور اللہ کی بات ہی غالب اور سربلند ہے" کا عملی ظہور ہو جائے۔

مگر انسان نے کیا کیا۔ دنیا کی چمک دمک اور فریبِ[1] شیطانی سے متاثر ہو کر دُور اندیشی[2] سے کام نہ لیا اور خواہشِ نفسانی کی پیروی میں خدا فراموشی[3] کا مُرتکِب[4] ہو گیا۔ اب پیغمبر کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ لوگوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرے۔ حق کی طرف دعوت دے اور باطل طریقوں پر چلنے کے خطرات سے آگاہ کرے۔ یعنی بندوں کو اپنے مالک سے متعارف کرائے اور اس حد تک جدوجہد کرے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بڑائی واقعی دنیا میں مانی جائے اور دینِ حق ثابت و قائم ہو جائے۔ پس تکبیرِ ربّ کا حقیقی مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ کی زمین پر اُسی کا قانون نافذ ہو، اُسی کے احکام اور اوامر[5] پر عمل ہو اور اس طرح اللہ تعالیٰ کو عملاً مقتدِرِ اعلیٰ[6] تسلیم کر لیا جائے۔

ان خطوط پر غور کیا جائے تو صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کا فرضِ منصبی دعوت و تبلیغ کے ساتھ ساتھ دینِ حق کو غالب کرنا اور باطل نظریات کو مٹانا بھی تھا۔ اسی بات کو قرآن مجید کی تین سورتوں میں وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ﴾ (سورۃ التوبہ 33، سورۃ الفتح 28، سورۃ الصّف:9) یعنی "وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (نظامِ اسلام) دے کر، تاکہ وہ اس (ہدایت اور دینِ حق) کو پورے کے پورے دین (نظامِ حیات) پر غالب کر دے"۔

چونکہ اب قیامت تک کوئی اور نبی یا رسول آنے والا نہیں ہے لہٰذا خالقِ کائنات نے انسانوں پر حجت پوری کرنے کے لیے آخری کتاب، مکمل ہدایت نامے کی صورت میں بھیج کر اُس کی حفاظت کا ذمہ بھی خود لے لیا تاکہ خدائی تعلیمات اپنے اصل الفاظ میں ہر طالبِ حق کے لیے قیامت تک محفوظ رہیں۔

(۱) دھوکہ (۲) عقل مندی (۳) خدا کو بھول جانا (۴) قصوروار (۵) احکام (۶) حاکمِ اعلیٰ

جس وقت آپ ﷺ پر دعوت وتبلیغ اور دینِ حق کے غالب کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی اُس وقت پورے عالمِ انسانیت میں اس دعوت کے علمبردار صرف آپ ﷺ ہی تھے۔ پورا ماحول جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ظلم وستم کا دور دورہ اور اخلاقیات (۱) کا جنازہ نکلا ہوا تھا۔ ان حالات میں دنیا کے اوّلین بت کدہ (۲) میں توحید کی آواز بلند کرنا، نعرۂ تکبیر بلند کرنا یعنی خدا کی کبریائی کو عملاً نافذ کرنے کی جدوجہد کا آغاز، غلبۂ دین کی سعی..... امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نفاذ، مکارمِ اخلاق (۳) کی ترویج (۴) کا علم بردار (۵) بن کر اٹھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ کیونکہ تکبیرِ رب کی خاطر کھڑے ہونے کا مطلب پورے معاشرے سے اعلانِ جنگ کرنا تھا۔ جس کا حکم آپ ﷺ کو دیا گیا۔ ﴿قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ (المدثر: 2 تا 3) یعنی "کھڑے ہو جاؤ پس (بنی نوع انسان کو) خبردار کرو! اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو!" پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ آپ ﷺ اس کام کو انجام دیتے رہیں خواہ کافروں اور مشرکوں کو کتنا ہی بُرا معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ نفاذِ حق کے لیے انقلابی انداز کی جدوجہد جن لوگوں کے مفاد کے خلاف جائے گی وہ تو ظلم وستم روا (۶) رکھیں گے۔ مصیبتوں کے پہاڑ توڑیں گے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اعلانِ نبوت سے پہلے جو لوگ آپ ﷺ کو صادق اور امین کہتے تھے، وہی آپ کے شدید ترین دشمن بن گئے۔ مگر آپ ﷺ تھے کہ استقامت (۷) کا پہاڑ بن کر حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہی حالات میں آپ ﷺ کو ایک ایک کر کے ساتھی ملنے لگے اور آپ بالکل یکتا وتنہا (۸) نہ رہے بلکہ اب ایک چھوٹی سی جماعت آپ ﷺ کے ساتھ ہوگئی۔ یہ آپ ﷺ کے سچے اُمتیوں کی تھی۔ یہ لوگ فرضِ منصبی کی ادائیگی میں حضور ﷺ کے مُمِد ومعاوِن (۹) بنے۔ اس راستے میں اُن پر جو مشکلات آئیں اور ظلم ڈھائے گئے یہ ایک لمبی داستان ہے۔ یہاں تک کہ انہیں مکّہ سے نکل جانے پر مجبور کیا گیا۔ پس حق کی بالادستی کیلیے پیغمبر کا دست وبازو (۱۰) بننا، اسی کا نام نُصرتِ رسول ہے اور اسی کا حکم قرآن مجید میں ﴿وَنَصَرُوْهُ﴾ کے الفاظ میں ہے۔

(۱) اچھی اخلاقیات (۲) مراد ہے خانہ کعبہ (۳) اخلاقی خوبیاں (۴) رواج دینا (۵) جھنڈا اُٹھانے والا (۶) جاری رکھنا (۷) ثابت قدمی (۸) اکیلے (۹) مددگار (۱۰) مددگار

حضور ﷺ کے اُمتی کی اہم ترین ذمہ داری

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ اصحابِ رسول ؓ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں آپ ﷺ کے دست وبازو بنے۔ ہر طرح کی تکالیف برداشت کیں۔ مگر آپ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بلکہ جاں نثاری کی وہ مثالیں قائم کیں کہ زمانہ اُن کی نظیر (۱) پیش کرنے سے قاصر ہے۔ جہاں حضور ﷺ کا پسینہ گرتا تھا وہاں وہ اپنا خون گرانے کے لیے تیار رہتے تھے۔ دعوت وتبلیغ کے کام میں وہ آپ ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے۔ معرکۂ کارزار (جنگ) میں آپ ﷺ پر جان نچھاور کرتے تھے۔ آپ ﷺ کے فرامین سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ وہ تھے آپ ﷺ کے حقیقی اُمتی اور آپ کے دست وبازو۔

چونکہ حضور ﷺ اللہ کی طرف سے آخری نبی اور رسول بنا کر بھیجے گئے تھے، لہٰذا آپ ﷺ کی رسالت ہی قیامت تک جاری وساری ہے اور یہی قرآن انسانوں کے لیے ضابطۂ حیات (۲) کے طور پر رہے گا۔ چنانچہ آج مسلمانوں کی وہی ذمہ داری ہے جو آپ کے صحابہ کرام ؓ کی تھی اور وہ ہے نصرتِ رسول ﷺ۔ یعنی آپ ﷺ کے مشن کو آگے بڑھانا، اس کا انداز یہی ہے کہ اپنی بہترین صلاحیتوں کو اللہ کے دین کی سربلندی (۳) کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس راہ میں مال خرچ کیا جائے، اوقات کو اقامتِ دین کی سربلندی میں لگایا جائے۔ ظاہر ہے یہ کام تو کرنے کے ہیں۔ زبانی دعوؤں کا ان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان کا وجود گواہی دے رہا ہو کہ ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱۶۲﴾ (الانعام:162) یعنی "میری نماز، میری عبادات اور میری زندگی اور میری موت، اللہ ہی کے لیے ہے جو پروردگار ہے تمام جہانوں کا"۔

نصرتِ رسول کے لفظ سے کسی کو خیال آ سکتا ہے کہ اللہ کے نبی اور رسول ﷺ کو کسی انسان کی مدد کی کیا ضرورت ہے؟ نبی کا مقام ومرتبہ تو یہ ہے کہ اللہ خود اُن ﷺ کا مولا (۴) اور مددگار ہے۔ پھر اللہ کے فرشتے اُن کے پشت پناہ (۵) ہیں۔ علاوہ ازیں

(۱) مثال (۲) زندگی کا دستور العمل (۳) غلبہ (۴) کارساز (۵) حمایتی

روح القدس (حضرت جبرائیلؑ) کی تائید[1] اُن کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر انہیں اہلِ ایمان کی نصرت کی کیا حاجت[2]۔تو جان لیجئے کہ عالمِ اسباب میں دینِ حق کے غلبہ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہے جن کو زمین میں اللہ کا خلیفہ قرار دیا گیا ہے۔انسانوں کی راہنمائی کے لیے اور انہیں بُھولا ہوا سبق یاد دلانے کے لیے اللہ تعالیٰ انبیاء ورُسل کو بھیجتا رہا ہے، تاہم اقامتِ دین، شہادتِ حق اور دعوت وتبلیغ کی جدوجہد انسانوں ہی کو کرنی ہوتی ہے۔ نبی اس دعوت وتبلیغ کا داعیٔ اوّل[3] ہوتا ہے اور وہی سب سے پہلے اس علَم[4] کو لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ اس کام میں داعیٔ اول تھے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا۔

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝۴۵ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝۴۶﴾ (الاحزاب:45تا46)

"اے نبی! ہم نے آپ کو گواہی دینے والا، بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔"

امتحان وآزمائش

نبی ﷺ کی پکار کو قبول کر کے جو لوگ اُن ﷺ کے ساتھی بن جاتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی آزمائش کرتا ہے، کیونکہ اس عالمِ اسباب میں دین کا پھیلانا اس کی دعوت کا عام ہونا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے لوگوں کی جدوجہد، ایثار وقربانی اور جذبۂ صادقہ کے ذریعہ ہی ممکن ہوگا۔تشریعی[5] طور پر اللہ کی بڑائی تو فی الواقع ان لوگوں کی محنت اور کوشش اور پھر جہاد وقتال ہی کے ذریعہ ہوگی۔ اس مشن میں نبی کے ساتھی جب پورے خلوص واخلاص کے ساتھ نکلیں گے تو اللہ کی تائید ونصرت کے ساتھ دین غالب ہوگا۔یہی سنّتُ اللہ ہے۔اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اُس کے دین کی سربلندی کے لیے دشمنانِ خدا ورسول کے بالمقابل سیسہ پلائی

(۱) حمایت (۲) ضرورت (۳) پہلا دعوت دینے والا (۴) جھنڈا (۵) قانونی طور پر

ہوئی دیوار[1] بن جائیں۔سورۃ الصّف آیت ۴ میں ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾

"یقیناً اللہ اُن کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر جنگ کرتے ہیں گویا کہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔"

اس جدوجہد اور کشاکش[2] میں مومنین صادقین کی آزمائش ہے اور اسی آزمائش کے نتیجہ میں کھوٹے اور کھرے کی پہچان ہوجاتی ہے۔ آپ ﷺ کے مشن میں آپ ﷺ کا ساتھ دیتے ہوئے تن من دھن کھپانے[3] کو اللہ تعالیٰ نصرتِ رسول ﷺ کہتا ہے۔سورۃ العنکبوت آیت ۱۱ میں فرمایا:

﴿وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝۱۱﴾

"اور اللہ لازماً ظاہر کردے گا ان کو بھی جو (واقعتاً) ایمان لائے ہیں اور ان کو بھی جو منافق ہیں۔"

یہ امتحان اور آزمائش دنیا کی زندگی میں ضروری ہے کیونکہ دنیا دارالعمل ہے۔انعام کا مستحق بننے کے لیے خلوص کے ساتھ جدوجہد ضروری ہے۔ جب کہ نِرا دعویٰ[4] کرنے والے ان آزمائشوں میں پورے نہیں اترتے۔ بہرحال نصرتِ رسول منصبِ رسالت کی تکمیل میں جان ومال صرف کرنا اور دعوت وتبلیغ کے کام میں صبر واستقامت اور پرخلوص جذبے کے ساتھ لگے رہنے کا نام ہے۔اگر یہ نہیں تو رسول ﷺ پر ایمان کا اعلان اور محبت کا دعویٰ باطل[5] ٹھہرے گا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مسترد[6] کردیا جائے گا۔

اپنا جائزہ خود لینے کی ضرورت!

ہجرت کے تیسرے سال غزوہ اُحد پیش آیا جس میں خود حضور ﷺ بھی اپنے جاں نثار صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ مشرکین کے سامنے سینہ سپر[7] تھے۔کفر واسلام کے اس خونی معرکے میں خود رحمت اللعالمین ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ دندانِ مبارک شہید

(۱) مضبوط دیوار (۲) کھینچا تانی (۳) ہر چیز فدا کرنا (۴) صرف دعویٰ (۵) غلط (۶) رد کرنا (۷) ڈٹ کر مقابلہ کرنا

ہوئے اور مقدس خون بھی راہِ حق میں بہا..... اور فرض کیجئے کہ عین اس وقت اگر کوئی عشقِ رسول ﷺ کا دعوے دار مدینہ کے اندر مسجد میں بیٹھا درود وسلام کا وِرد کر رہا ہوتا، کیف و وجدان (۱) میں نعتیں پڑھ رہا ہوتا تو یہ بڑی مضحکہ خیز (۲) بات ہوتی۔ کیونکہ یہ طرزِ عمل ایمان بالرّسالت اور محبتِ رسول ﷺ کے ساتھ کوئی نسبت نہ رکھتا۔ اب ذرا اپنے حالات کا جائزہ لیجئے۔ آج کی صورت حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ پوری دنیا پر طاغوتی (۳) طاقتیں چھائی ہوئی ہیں۔ اسلامی شعائر اور تعلیمات کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لیے ہر ممکن سعی (۴) کی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا مشن مردہ نہیں ہوا بلکہ زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا۔ دین کو سربلند کرنے کا فریضہ اب امّت کے ذمہ ہے۔ اس وقت اگر کوئی شخص حضور ﷺ کے عشق کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کے اظہار کے لیے درود وسلام اور زبانی جمع وخرچ کرتے ہوئے عقیدت کے پھول بکھیرتا پھرتا ہے مگر اسلامی اَقدار کی پامالی اور مسلمانوں کی زبُوں حالی (۵) پر اُسے کوئی تشویش (۶) نہیں ہوتی اور فواحش ومنکرات کے فروغ (۷) پر اس کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں آتی تو یہ کیسی محبت اور کیسا عشق ہے۔

حضور ﷺ کی رسالت تا قیامِ قیامت ہے۔ اب کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ حضور ﷺ کا مشن جاری وساری ہے۔ حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت (۸) کی تکمیل اب افرادِ امّت کے ذمہ ہے۔ یعنی اللہ کے دین کو عملاً غالب اور قائم کرنا۔ یہ مشن اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک اس پُورے کرۂ ارضی پر اللہ کا دین غالب نہیں ہو جاتا۔ اس کام میں رسول اللہ ﷺ نے اپنی عمر کے ۲۳ سال صرف کئے اور نتیجہ کے طور پر جزیرہ نمائے عرب کی حد تک نظامِ باطل کا قلع قمع (۹) کر کے حق کا بول بالا کر دیا۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں دینِ اسلام کی سربلندی کا یہ فریضہ آپ ﷺ نے امت کے سپرد کیا تھا۔ چنانچہ اب یہ امتِ مسلمہ کا فرض ہے کہ دین کی سربلندی کے لیے ہمہ تن

(۱) سرور (۲) ہنسی مذاق کی بات (۳) شیطانی (۴) کوشش (۵) خراب حالت
(۶) پریشانی (۷) پھیلنا (۸) بھیجا جانا (۹) ختم کرنا

مصروف ہو اور مقصدِ رسالت کی تکمیل کے لیے کوشاں رہے۔

وَقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام (۱) ابھی باقی ہے

اب ہر مدعی ایمان، عاشقِ رسول اور محبِّ رسول ﷺ کو اچھی طرح اپنا جائزہ لینا چاہئے کہ وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ اگر اُسے آنحضرت ﷺ کے مقصدِ بعثت اور آپ ﷺ کے مشن سے کوئی دلچسپی نہیں تو اُسے خود سمجھ لینا چاہئے کہ اُس کے دعویٰ میں کس قدر صداقت (۲) ہے جب کہ آج کی صورت حال ہر ایک کے سامنے ہے۔ بقول حالی مرحوم

جو دِین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریبُ الغُرَباء (۳) ہے

مستقبل کے بارے میں حضور ﷺ کی تلقین

صادق المصدوق، النّبی الاُمّی ﷺ نے ہمیں پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ))

"اسلام کی ابتداء اجنبیت کی حالت میں ہوئی تھی اور یہ اسی حالت میں پھر لوٹ آئے گا۔ تو بشارت ہے "غُرَباء" کے لیے۔"

یہ "غُرَباء" کون ہیں۔ عربی زبان میں غریب کے معنی اجنبی کے ہیں۔ اسی طرح "غریب الوطن" مسافر کو بھی کہا جاتا ہے۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کا آغاز اجنبیت سے ہوا۔ یعنی مسلمانوں کو کوئی پوچھتا تک نہ تھا اسلام اجنبی اور تنہا تھا۔ (بعد میں اسلام کو شان وشوکت ملی مگر) پھر دوبارہ ایسا زمانہ آئے گا کہ وہ پھر اجنبی ہو جائے گا۔ یعنی کفّار، مُلحدین اور بدعات کو فروغ دینے والوں کی کثرت ہوگی اگرچہ نام کے مسلمان کثیر تعداد میں ہوں گے مگر سچے، مخلص اور متّقی افراد کم سے کم ہوتے چلے جائیں گے تو اس حدیث میں ان قلیل یعنی غرباء کے لیے جنت کی بشارت ہے۔

(۱) تکمیل (۲) سچائی (۳) بالکل اجنبی

مُسند احمدؒ کی ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود غرباء کا مطلب واضح کر دیا۔ آپ نے فرمایا ((اَلْغُرَبَاۗءُ الَّذِیْنَ یُحْیُوْنَ سُنَّتِیْ وَیُعَلِّمُوْنَهَا النَّاسَ)) "غرباء" وہ ہیں جو میری سنت کو زندہ کریں گے اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں گے۔ اب ہر مسلمان اپنا جائزہ بڑی آسانی سے لے سکتا ہے کہ اس دور میں وہ بھی "غرباء" میں شامل ہے یا نہیں۔ اگر وہ غرباء میں شامل ہے تو اُس کی خوش بختی کا کیا کہنا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک اور پیشینگوئی اس طرح سے ہے ((لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ)) "اسلام میں اس کے نام کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں اس کے حروف کے سوا کچھ باقی نہ بچے گا"۔ اس حدیث پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ آج کے دور پر یہ حدیث کس طرح صادق نظر آتی ہے۔ آج رُوئے زمین پر کہیں بھی اسلام فی الواقع قائم نہیں۔ خود مسلمانوں کا کردار اسلامی تعلیمات سے دور ہے۔ قرآن کی حیثیت محض ایک مقدس کتاب کی رہ گئی ہے جسے حصولِ ثواب وایصالِ ثواب کے لیے پڑھا جاتا ہے۔ قرآن سے مسلمانوں کی اَجنَبِیَّت اس حد تک ظاہر ہو رہی ہے کہ وہ قرآنی فیصلوں کو بھی تسلیم کرنے تک آمادہ نہیں۔ (الّا ماشاءاللہ)

آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ صُورتِ حال عَمَلاً پیدا ہو چکی ہے جس کی خبر ان احادیثِ مبارکہ میں دی گئی ہے۔ اس صورت حال میں ہم میں سے ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنا جائزہ لے کر فیصلہ کرے کہ اگر اُسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہے، اگر اُسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی مخلصانہ تعلق ہے، اگر وہ سمجھتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس کا رشتہ صحیح بنیادوں پر قائم ہے تو کیا اُس کی زندگی کا مقصد اور نصب العین بھی وہی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصدِ بعثت تھا؟ یعنی اللہ کے کلمے کی سربلندی، پورے نظام پر دینِ حق کا نفاذ اور اللہ کی بڑائی کو بالفعل [1] قائم و نافذ کرنا۔

(۱) عملاً

اِتّباع کا تقاضا

"نصرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کی مزید وضاحت "اتّباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم" کے حوالہ سے بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اتّباع کے معنی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلنا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر عمل کی پیروی کرنا۔ اب ہمیں غور کرنا چاہئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ میں جو عمل تواتر کے ساتھ ہُوا ہے، پیہم و مسلسل ہُوا ہے۔ جو پورے تئیس برس تک شب و روز ہُوا ہے، جس میں ایک لمحہ اور ایک گھڑی کا وقفہ نہیں، وہ عمل کیا ہے؟ نماز کے بارے میں پوچھا جاسکتا ہے کہ کب فرض ہوئی؟ رکعتوں کا تعین کب ہوا؟ کب دو تھیں اور کب چار ہوئیں؟ روزوں کی فرضیت کب ہوئی؟ زکوٰۃ کا نظام کب قائم ہوا اور مِقدارِ نصاب کب متعیّن [1] ہوئی؟ شراب و قِمار [2] کب حرام ہوئے؟ سود کی حرمت کا حکم کب نازل ہوا۔ ان سب کے لیے احادیث اور سیرت سے اوقات اور زمانے کا تعین کیا جاسکتا ہے، جس میں اختلاف بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ایک بات متفق علیہ ہے جس میں کسی اختلاف اور قیل وقال [3] کی گنجائش نہیں اور وہ بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اوّل یومِ بعثت [4] سے لے کر اس حیاتِ دنیوی کے آخری سانس تک جو عمل پیہم، مسلسل اور متواتر شب و روز کیا ہے، جلوت وخلوت [5] میں کیا ہے، وہ دعوت وتبلیغ کا عمل ہے، وہ تکبیرِ رب کی سعی و جُہد ہے۔ وہ اِعلائے کَلِمَۃُ اللہ [6] کے لیے جہاد ہے۔ وہ دینِ حق کو سربلند کرنے کی تگ ودَو [7] ہے، وہ غلبہ واقامتِ دین کے لیے مجاہدہ وتصادُم ہے۔ اس مجاہدہ و جہاد کی شکلیں بدلی ہیں، صورتوں میں تبدیلی آئی ہے، بتدریج مختلف مراحل آئے ہیں۔ کہیں مکی دور میں یہ جد و جہد دعوت وتبلیغ اور شدائد ومصائب [8] کے برداشت کرنے کے درجہ میں تھی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طائف کے گلی کوچوں میں پتھر بھی کھانے پڑے۔ کہیں وہ مدنی دور میں باطل کے ساتھ مسلح تصادم کے نتیجے میں بدر واُحد اور احزاب وتبوک کے معرکوں کی صورت میں نظر آتی ہے، کہیں قبائلِ عرب اور قرب و جوار [9] کے

(۱) مقرر (۲) جُوا (۳) بحث مباحثہ (۴) اعلانِ نبوت (۵) محفل اور تنہائی
(۶) دینِ حق کی سربلندی (۷) کوشش (۸) سختیاں اور تکالیف (۹) آس پاس

سلاطین کو وفود و خطوط کے ذریعہ دعوت دینے کے مراحل میں تھی، کہیں صلح حدیبیہ، فتح مکہ اور غزوۂ حنین کی صورت میں جاری و ساری تھی۔ لیکن آپ ﷺ کا جو عمل تئیس سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے، ہر لمحہ ہر گھڑی اور ہر آن انجام دیا جا رہا ہے، وہ ہے عملِ دعوت و تبلیغ۔ اب جو شخص بھی متّبع [1] رسول ﷺ ہونے کا مدعی ہو، جو یہ سمجھتا ہو کہ سنّتِ رسول ﷺ کا التزام [2] ضروری ہے، اس کے بارے میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کی زندگی میں آنحضور ﷺ کی سب سے بڑی، سب سے زیادہ متواتر متفق علیہ اور ثابت شدہ سنت کس حال میں ہے؟ اس کے اندر دعوت و تبلیغ کی کتنی تڑپ اور کتنی لگن ہے؟ اور وہ اس کام میں کتنا وقت خرچ کر رہا ہے اور کتنا مال لگا رہا ہے؟

رسول ﷺ کی نُصرت -- اللہ کی نصرت ہے

رسول ﷺ کے مشن میں آپ ﷺ کا ساتھ دینا نصرتِ رسول ہے اور یہ نصرتِ رسول ﷺ درحقیقت اللہ کی نصرت ہے۔ یوں اس عمل کی عظمت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سورۃ الصّف کی آخری آیت میں ذکر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں [3] سے دریافت فرمایا۔ ﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ﴾ یعنی اللہ کے راستے میں میرا مددگار کون ہے؟ تو حواریوں کا جواب اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں نقل کرتا ہے ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ﴾ یعنی ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ اللہ تو کسی قسم کی مدد کا محتاج نہیں۔ وہ تو کُنْ فَیَکُوْنُ [4] کے اختیار کا مالک ہے۔ پھر اُس کی مدد کیسی؟ تو جان لیجئے! جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے، اس عالمِ اسباب میں جو بھی جدوجہد ہوگی وہ انسانوں ہی کو کرنی ہے۔ قادرِ مُطلق نے تو اپنی پسند اور ناپسند لوگوں پر واضح کر دی۔ تو اب جو شخص دنیا میں خدا کی رضا کے راستے پر چل کر اُس کی مرضی کو غالب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُسے اپنی مدد شمار کرتا ہے۔ بس جو شخص فریضہء رسالت کی ادائیگی میں اللہ کے رسول ﷺ کا ساتھ دیتا ہے اور اس راہ میں اپنی صلاحتیں، وقت اور مال خرچ کرتا ہے تو وہ اللہ کے رسول ﷺ کی نصرت تو کر ہی رہا ہے مگر یہی اللہ کی نصرت بھی ہے۔

(۱) پیروی کرنے والا (۲) لازم بنانا (۳) دفادار ساتھی (۴) ہو جانے کے حکم پر ہو جانا

اِتّباعِ نور یعنی قرآنِ مجید کی تعلیمات پر عمل

سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کے مطابق رسولِ کریم ﷺ کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی بنیاد قرآن مجید کا اتّباع یعنی پیروی ہے۔ قرآن کو یہاں نور فرمایا گیا ہے یعنی اس روشنی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس کو غنیمت جان کر اس کو پڑھا جائے۔ سمجھا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ اگرچہ اس آیت میں بیان کردہ پہلی تین باتوں۔ ایمان بالرّسالت، نبی ﷺ اُمّی کی عزت و تکریم اور نصرت و حمایت سے ہی بات واضح ہو گئی تھی مگر قرآن کی پیروی کو الگ کر کے بیان کیا گیا۔ وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو بہر حال اس فانی دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے۔ ایک مختصر مدت کیلیے آپ ﷺ کی صحبت صحابہ کرامؓ کو میسر رہی۔ مگر جس چیز کو ہمیشہ کے لیے رسول اللہ ﷺ کا قائم مقام بننا تھا وہ یہی قرآن مجید ہے۔ یہ اللہ کا وہ کلام ہے جو آپ ﷺ پر نازل ہوا اور یہ وہ نور ہے جو ہمیشہ روشنی پھیلاتا رہے گا۔ چنانچہ اسی حقیقت کو نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر آخری وصیت کے طور پر ارشاد فرمایا۔ ((وَقَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِہٖ فَلَنْ تَضِلُّوْا اَبَدًا وَھُوَ کِتَابُ اللّٰہِ)) (صحیح مسلم) "اور میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جا رہا ہوں جس کو اگر تم مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ چیز ہے اللہ کی کتاب، یعنی قرآن مجید"۔

افرادِ اُمت کے ساتھ آپ کی یہ الوداعی گفتگو تھی جس کے آغاز میں آپ ﷺ نے فرمایا "اے لوگو! میری بات غور سے سنو۔ کیونکہ شاید اس سال کے بعد اس مقام پر میں تم سے دوبارہ نہ مل سکوں"۔ اسی خطبے کے آخری حصے میں آپ ﷺ نے تاکید کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ "قرآن پاک کو مضبوطی سے تھامے رکھنا اس کا دامن پکڑے رکھنا اور ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ میں تم کو بے یار و مددگار چھوڑ کر جا رہا ہوں، تمہاری ہدایت اور راہ نمائی کے

لیے میں اپنے پیچھے اللہ کی کتاب چھوڑے جارہا ہوں' اللہ کا نازل کردہ وہ نور چھوڑے جارہا ہوں جو تمہیں کفر وشرک کے اندھیروں سے نکال کر توحید کی سیدھی راہ کی طرف لے جائے گا۔ اگر تم اس قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے"۔

رسول اللہ ﷺ نے قرآن پاک کو حَبْلُ اللهِ یعنی اللہ کی رسی قرار دیا ہے۔ اس حدیث کے راوی حضرت علیؓ ہیں۔ اس طویل حدیث میں یہ الفاظ نہایت لائقِ توجہ ہیں کہ" قرآن مجید وہ کتاب ہے جس سے علماء کبھی سیری[1] محسوس نہ کریں گے۔ کثرت اور بار بار کی تلاوت سے اس کتاب پر کبھی باسی پن طاری نہ ہوگا اور نہ ہی اس کے عجائبات کبھی ختم ہوں گے۔"

یہ حدیث دراصل قرآن مجید کے الفاظ کی تشریح ہے۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں ارشاد ہے ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ﴾[2] یعنی اللہ کے ساتھ چمٹ جاؤ۔ اللہ کے دامن سے وابستہ ہوجاؤ۔ تو اللہ کے دامن سے کیسے جڑ جائیں؟ اس بات کو سورۂ آل عمران آیت نمبر 103 میں مزید کھولا گیا ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کی رسی سے کیا مراد ہے؟ حضرت علیؓ سے مروی حدیث جس کا ابھی حوالہ دیا گیا اس کے اندر یہ وضاحت موجود ہے کہ ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) یعنی" یہی قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے"۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پختہ کرنے کیلیے قرآن مجید کے ساتھ تعلق کو مضبوط کرنا بہت ضروری ہے اور یہی بات سورۃ الاعراف کی مذکورہ آیت نمبر ۱۵۷ میں بیان کی گئی ہے۔

مَوجُودہ صُورتِ حال

رسول اللہ ﷺ کی زوردار نصیحت بلکہ وصیت تو یہ تھی کہ قرآن مجید کو مضبوطی سے تھامے رکھنا تاکہ گمراہ نہ ہوجاؤ۔ مگر ہم اسی حبل اللہ کے ساتھ اپنے تعلق کو کمزور سے کمزور تر کرتے چلے گئے۔ صورت حال یہاں تک پہنچی کہ اس کی تلاوت محض حصولِ ثواب یا ایصالِ ثواب کے لیے رہ گئی۔ اسے ضابطۂ حیات اور راہ نما سمجھنا صرف تقریر وتحریر کی

(۱) نیت بھرنا (۲) الحج:78

حد تک رہ گیا۔ اس کے احکام پر عمل کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ چونکہ آپ ﷺ نے بتادیا تھا کہ اس قرآن کو تھامے رکھنا گمراہی سے بچائے گا تو اس کو چھوڑنے کا[3] نتیجہ خود بخود گمراہی کی صورت میں ہی نکلنا تھا۔ جو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جب تک مسلمانوں نے قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھا، یعنی اس کی راہ نمائی میں زندگی گزارتے رہے، انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر ان کا رعب ودبدبہ قائم رہا اور دنیا میں وہ سربلند وغالب رہے۔ لیکن جیسے جیسے وہ اللہ کی کتاب سے دور ہوتے چلے گئے، ویسے ویسے اُن پر زوال کے سائے گہرے ہوتے چلے گئے۔ ان کے عقائد خراب ہوگئے۔ اعمال بگڑ گئے۔ بدعات نے رواج پکڑا۔ خواہشِ نفس کی پیروی شروع ہوئی۔ اس صورت حال میں مسلمان سیسہ پلائی دیوار تو کیا بنتے بے شمار فرقوں، قومی ونسلی اور لسانی وجغرافیائی گروہوں میں تقسیم ہوکر اپنی شان وشوکت اور عزت ووقار بھی کھو بیٹھے۔ ہم اس بات کو کیوں بھول گئے کہ قرآن، خدا کا کلام، لوگوں کے لیے ہدایت اور ضابطۂ حیات ہے۔ یہ صرف حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کے لیے نہیں بلکہ پڑھ کر سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کے لیے ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار[1] ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

سورۃ الفرقان آیت نمبر ۳۰ میں نبی اکرم ﷺ کی، اللہ کے حضور ایک دردمندانہ شکایت نقل کی گئی ہے۔

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰﴾

"اور رسول ﷺ نے کہا کہ اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو پسِ پشت ڈال دیا تھا (نظر انداز کردیا تھا)۔"

اگرچہ یہاں اصلاً تذکرہ اُن کفّار کا ہے، جنہوں نے قرآن کو اللہ کا کلام اور وحی

(۱) ذلیل۔ رسوا

ربّانی تسلیم کرنے سے انکار کردیا تاہم قرآن کے وہ ماننے والے بھی اسی ذیل[1] میں آتے ہیں جنہوں نے قرآن پاک سے راہنمائی حاصل کرنے کے سلسلہ میں کوتاہی کی رَوِش[2] اختیار کررکھی ہے۔ اس کوغور سے پڑھنا، سمجھنے کی کوشش کرنا اور پھر اس کے مطابق زندگی بسر کرنا اُن کے پروگرام میں شامل ہی نہیں۔ حالانکہ حکم یہ تھا کہ قرآن سیکھو۔ اس پرعمل کرواور اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔ جب مسلمان خود ہی اس نُور سے دُور ہوچکے ہوں تو دوسروں کو اس کی دعوت کیا دیں گے۔

اصلاحِ حال کا واحد راستہ

یہاں پہنچ کر اگر اصلاحِ احوال کی کوئی خواہش پیدا ہوئی ہوتو اس سلسلہ میں ایک جامع حدیث ملاحظہ ہو۔

يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ اٰنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَاَفْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

"اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بنالو، بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے اور اس کو (چہار دانگ عالم[3] میں) پھیلاؤ، اور اس کو خوش الحانی سے حظ[4] لیتے ہوئے پڑھا کرو، اور اس میں تدبر اور غور وفکر کیا کرو..... تاکہ تم فلاح پاؤ۔"

آیئے اس قولِ رسول ﷺ پر غور کریں۔ مسلمانوں کو اہلِ قرآن کے الفاظ سے خطاب فرما کر حضور ﷺ یہ احساس دلا رہے ہیں کہ اے مسلمانو! قرآن تمہارا ہے اس کو OWN[5] کرو۔ اس کے ساتھ جُڑ جاؤ۔ پھر متوقع خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن کو تکیہ نہ بنالینا۔ تکیہ کے ساتھ ٹیک لگا کر آدمی سہولت محسوس کرتا ہے پس مطلب یہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کو محض ایک سہارا بنالو۔ اُس کے ساتھ عقیدت کا اظہار کرکے، قیمتی جُزدان پہنا کر، آنکھوں سے لگا کے، پیشانی پر بوسہ دے کر، اونچی جگہ

(۱) تحت (۲) طریق (۳) ساری دنیا (۴) لطف (۵) اپنا سمجھو

پر رکھ دو اور پھر کبھی کبھی حصولِ ثواب کے لیے محض تلاوت کرکے اپنے آپ کو مطمئن کرلو۔ یہ جھوٹا اطمینان ہے۔ ایسا نہ کرنا۔

پھر فرمایا "دن اور رات کے اوقات میں قرآن کی تلاوت اس طرح کرو جس طرح تلاوت کرنے کا حق ہے"۔ یعنی تلاوت کے وقت عقیدت اور محبت بھی ہو اور سمجھنے اور عمل کرنے کا ارادہ بھی ہو۔ پھر اس کو پھیلاؤ۔ یعنی خود اپنے عمل میں اسے لاؤ گے تو دوسرے کے سامنے پیش کرسکو گے۔ اسے پڑھو خوش الحانی کے ساتھ۔ اسی کو قرآن مجید میں ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝﴾[1] کہا گیا ہے۔ کیونکہ خوش الحانی کے ساتھ پڑھنا تب ہی ممکن ہے جب آدمی ٹھہر ٹھہر کر پڑھ رہا ہو اور آخری بات یہ فرمائی کہ اس پر غور وفکر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

پس ظاہر ہے کہ فوز وفلاح[2] مطلوب ہو تو قرآن سے جڑنا پڑے گا۔ آخرت کا معاملہ تو ہے ہی، دنیا میں بھی مسلمانوں کا عروج وزوال قرآن کے ساتھ وابستہ[3] ہے۔ حضرت عمر بن خطابؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ﴾ یعنی "اللہ اس کتابِ عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت وسربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو (اس کتاب کے چھوڑنے کی وجہ سے) ذلت ورسوائی سے دوچار کرے گا۔"

آیاتِ قرآنی اور فرامینِ رسول ﷺ کی روشنی میں تفصیلی طور پر یہ بات ہمارے سامنے آئی ہے کہ مسلمانوں کی پستی، گراوٹ اور زوال دراصل قرآن مجید سے دوری کا نتیجہ ہے۔ یہی بات امت کے بلند پایہ علمائے حق کہتے چلے آرہے ہیں۔

یہاں ایک بہت بڑے عالمِ دین[4] کا قول نقل کیا جارہا ہے انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا کہ "جہاں تک میں نے غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیّت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، اور دوسرا آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ لہٰذا میرے خیال میں اس صورت

(۱) المزمل: ۴ (۲) کامیابی (۳) جُڑا ہونا (۴) مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

حال سے نکلنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ایک جانب قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کیلیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی قائم کئے جائیں، بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے رُوشناس[1] کرایا جائے نیز قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے انہیں آمادہ[2] کیا جائے اور دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال[3] کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

چنانچہ جو لوگ صحیح معنوں میں پاکستان کے اندر حالات کی اصلاح چاہتے ہیں ان کی تمام تر توجہ اللہ کی کتاب کی خدمت میں لگ جانی چاہئے۔ قرآنِ مجید کو پڑھنے پڑھانے، سمجھنے سمجھانے، اس کی دعوت کو عام کرنے کو مقصدِ زندگی بنا کر مصروفِ عمل ہوجانا چاہئے۔ خلوص کے ساتھ کی گئی یہ کوشش کامیاب ہوگی جس کے نتیجہ میں جملہ مسائل حل ہوجائیں گے۔ ایمان ویقین پختہ ہوگا۔ عقائد درست ہوں گے۔ شرک و بدعت سے نفرت ہوگی۔ اَخلاق وعمل میں اصلاح ہوگی اور ایسا معاشرہ قائم ہوگا جو اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق ہوگا۔ نبی اکرم ﷺ کے طریقِ کار کی پیروی میں ہی اسلامی نظام کا قیام ممکن ہے اور کسی طریقے سے نہیں۔

قرآن سیکھنے اور سکھانے کی اہمیت

یوں تو قرآن وحدیث میں قرآن سیکھنے اور سکھانے کے فضائل پر کافی مواد موجود ہے تاہم یہاں غور وفکر کی غرض سے تین احادیث درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ حضرت عثمانؓ راوی ہیں اور یہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ دوسری کتب حدیث میں بھی موجود ہے۔

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتے ہیں"۔

۲۔ دوسری حدیث کے راوی حضرت جبیر بن مطعمؓ ہیں اور یہ طبرانی کبیر میں موجود ہے۔

(۱) آگاہ (۲) تیار (۳) لڑائی جھگڑے

((قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلَيْسَ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللهِ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِاللهِ؟ قُلْنَا بَلٰى قَالَ: فَاَبْشِرُوا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ طَرَفُهٗ بِيَدِاللهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ فَتَمَسَّكُوْا بِهٖ فَاِنَّكُمْ لَنْ تَهْلِكُوْا وَلَنْ تَضِلُّوْا بَعْدَهٗ اَبَدًا))

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا "کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے"۔ ہم نے عرض کیا یقیناً! تب آپ ﷺ نے فرمایا "پس خوشیاں مناؤ اس لیے کہ اس قران کا ایک سرا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور ایک (دوسرا) سرا تمہارے ہاتھ میں۔ پس اسے مضبوطی سے تھامے رکھو۔ (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم اس کے بعد نہ کبھی ہلاک ہوگے اور نہ گمراہ"۔

۳۔ تیسری حدیث کے راوی حضرت ابوسعید الخدریؓ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

((قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ كِتَابُ اللهِ هُوَ حَبْلُ اللهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ)) "رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی کتاب ہی اللہ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے"۔

خلاصۂ کلام

اس ساری تفصیل سے یہ بات سامنے آئی کہ رسول اللہ ﷺ کا سچا اُمتی بننے کی پہلی شرط ایمان ویقین ہے اور دوسری عزّت و اِحترام ہے جو دراصل پہلی شرط کا لازمی تقاضا ہے۔عزت واحترام کا جذبہ ہوگا تو حقیقی محبت پیدا ہوگی جس سے اطاعت واتّباع کی توفیق ملے گی۔تیسری شرط نصرت ہے۔یعنی جس کام میں حضور ﷺ زندگی بھر مصروفِ عمل رہے اُسی کو ہم اپنی زندگی کا مقصد بنالیں۔جس طرح آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں جزیرہ نمائے عرب کی حدتک دینِ حق کو غالب کردیا ہم اس کام کو آگے بڑھائیں۔یہاں تک کہ پورے کرۂ ارض پر غلبہ دین کا مقصد پورا ہو۔یہ کام اُمّت کے ذمہ قرض ہے جس کی ادائیگی ہر اُس شخص پر فرض ہے جو آپ ﷺ کے دامن سے وابستہ ہے اور حضور ﷺ کا اُمتی کہلاتا ہے۔اس ضمن میں چوتھی چیز جو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ میں بیان ہوئی وہ قرآن مجید کی پیروی ہے کیونکہ دینِ حق کے غلبہ کی طرف چلنے کے طریقِ کار کی راہنمائی اور اپنی زندگیوں کو صاف ستھرا بنانے کا طریقہ ہمیں اسی سے حاصل ہوگا۔

ہمیں اس کتاب (قرآن) کو مضبوطی سے تھام کر دعوتِ اسلام کے مشن پر نکلنا ہوگا تاکہ رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل میں جدوجہد کرکے ہم دنیا وآخرت میں سُرخرُو[1] ہوسکیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں آنحضور ﷺ کا سچا اُمتی بننے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○

(اور ہماری آخری پکار یہ ہے کہ تمام تعریفیں اور شکر اس اللہ کے لیے ہیں
جو تمام جہانوں کا رب ہے)

☆ — ☆ — ☆

---

(۱) مطمئن۔کامیاب

نام کتاب ..... "سچا اُمتی کون؟"
تعداد(مارچ 2015ء) (دسمبر 2016ء).....6600
تعداد(جولائی2018ء) (جولائی،اگست2019ء) 18200
تعداد(اکتوبر2021ء) 1100
تعداد(اگست2023ء) 2200
مقامِ اشاعت..... دارالاسلام مرکز تنظیم اسلامی ملتان روڈ لاہور
مطبع ..... دارالناشر پرنٹنگ پریس، لاہور
ہدیہ/انفاق 40روپے

email: markaz@tanzeem.org
website: www.tanzeem.org

دارالاسلام، مرکز تنظیم اسلامی ملتان روڈ چوہنگ لاہور۔53800
فون:(78-35473375 (042
ای میل:markaz@tanzeem.org
www.tanzeem.org

مراکز حلقہ جات

	فون	موبائل	ای میل
مالاکنڈ	0345-9535853	0343-0912306	timergara@tanzeem.org
پشاور	091-2262902	0334-8937739	peshawar@tanzeem.org
اسلام آباد	051-2340147	0302-5089782	islamabad@tanzeem.org
راولپنڈی	051-4866055	0333-5127663	rawalpindi@tanzeem.org
مظفر آباد	0582-2447221	0300-7879787	muzaffarabad@tanzeem.org
گوجرخان	051-4620514	0311-5030220	gujjarkhan@tanzeem.org
گڑھی شاہو لاہور	042-36293939	0331-4152275	lahoreeast@tanzeem.org
سمن آباد لاہور	042-37520902	0300-8454938	lahorewest@tanzeem.org
گوجرانوالہ	0533600937	0334-4600937	gujranwala@tanzeem.org
سرگودھا	0300-9603045	0300-9603577	sargodha@tanzeem.org
فیصل آباد	0418732325	0321-7223010	faisalabad@tanzeem.org
ساہیوال ڈویژن	0457-830884	0300-6949044	sahiwal@tanzeem.org
بہاولنگر	0333-6314149	0333-6305730	bahawalnagar@tanzeem.org
ملتان	061-6520451	0321-6313031	multan@tanzeem.org
سکھر	071-5807281	0345-5255100	sukkur@tanzeem.org
حیدرآباد	022-2106187	0333-2608043	hyderabad@tanzeem.org
یاسین آباد کراچی	021-36823201	0321-8110205	karachinorth@tanzeem.org
گلشن اقبال کراچی	021-34816581	0321-9261317	karachicentral@tanzeem.org
سوسائٹی کراچی	021-34306041	03002435625	karachisouth@tanzeem.org
کوئٹہ	081-2842969	0346-8300216	quetta@tanzeem.org